قرآن شناسی

جدید تفسیر قرآن کا ایک تنقیدی جائزہ

ذاکر اہلبیتؑ جناب رضا عباس علومی صاحب

قرآن کریم وحی الٰہی کا نقطۂ مختتم اور خالق کائنات کی بے پناہ رحمتوں کا مظہر ہے۔ یہ پیغمبرؐ اسلام حضور ختمی مرتبت کا ایک زندہ جاوید معجزہ اور اپنی زبان و بیان اور موضوعات کی ندرت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس کتاب ہدایت نے گزشتہ چودہ صدیوں سے بھی زیادہ عرصہ میں انسانی سماج پر جو اثرات مرتب کئے ہیں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم کے علاوہ دنیا کی کسی دوسری کتاب نے انسان کی زندگی میں کبھی اتنی بڑی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ اس کتاب نے ایک نہایت مختصر سے عرصہ میں ایک جاہل، توہم پرست، بداخلاق اور پسماندہ سماج کو ایک بیدار، باشعور اور تعلیم یافتہ قوم میں تبدیل کر دیا۔

ویسے تو ہر مسلمان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ عربی زبان میں کم سے کم اتنی صلاحیت ضرور حاصل کرلے گا کہ قرآن مجید کے معنیٰ و مفاہیم اور اس کے موضوعات سے براہ راست فائدہ حاصل کر سکے۔ مگر پھر بھی قرآن کی آفاقیت کا تقاضا ہے کہ اس کا دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اس کا لازوال پیغام اس کرۂ ارض کے کونے کونے تک پہنچ جائے، کیونکہ یہ کسی ایک ملک و ملت کے لئے نہیں بلکہ یہ پوری دنیائے بشریت کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ اس بات کی بھی ضرورت رہی ہے کہ اس آخری الٰہی کتاب کی کماحقہ اس طرح تفسیر کی جائے کہ وقت کی ضرور اور بدلتے حالات میں انسانی مسائل کا حل دریافت کیا جا سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی خیال کے مدنظر پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد قرآن کریم کے متعدد ترجمے اور تفسیریں منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

جہاں تک قرآن کے انگریزی ترجموں کا سوال ہے، تو زیادہ تر ترجمہ مشنریز یا پھر مستشرقین ہی نے کئے ہیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں قرآن کریم کے متعدد ترجمہ اور تفسیریں مسلمان علماء اور مستشرقین دونوں کے ذریعہ سامنے آئی ہیں اور یقینا قرآن کے پیغام اور اس کے مشن کی تبلیغ و ترویج میں بہت معاون ثابت ہوئی ہیں۔ چونکہ قرآن ایک الہامی کتاب ہدایت ہے جو علامتی زبان میں نازل ہوئی ہے لہٰذا اس کا ترجمہ بھی یقینا ایک بے حد مشکل اور دشوار امر ہے۔ اس لئے اس کے زیادہ تر ترجموں میں کسی نہ کسی پہلو سے کمی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ انگریزی زبان کے تعلق سے یہ کام اور بھی مشکل نظر آتا ہے، کیونکہ اردو یا فارسی کے برعکس انگریزی زبان اپنے مزاج اور جملوں کی ساخت کے اعتبار سے عربی سے مختلف ہے۔ قرآن کریم کے زیادہ تر انگریزی ترجمے اس لئے بے جان نظر آتے ہیں کہ یا تو وہ بائبل کے انداز میں کئے گئے ہیں یا پھر بالکل لفظی ترجمے

ہیں۔ لفظی ترجمہ کرنے کے نتیجہ میں قرآن کی ادبیّت، روانی، بلاغت اور دلکش انداز بیان مفقود ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ایسے ترجمے انسان کے روحانی شعور میں وہ تلاطم اور انقلابی فکر پیدا کرنے سے قاصر ہیں جو قرآن ہر مخاطب کے دل میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قرآن کے لفظی ترجمہ کو پڑھ کر قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی کتاب ہے جس نے پوری دنیا کو اپنا نظیر پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے؟ دوسری جانب کچھ انگریزی ترجمہ، جناب این۔ جے۔ داؤد کے ترجمہ سمیت خوبصورت اور ادبی تو ہیں مگر وہ اصل متن سے اتنے آزاد ہیں کہ انھیں ترجمہ سے زیادہ ترجمانی کہنا بہتر ہوگا۔ مولانا **علامہ سید علی محمد نقوی صاحب نے اپنے ترجمہ (The meaning of the holy Quran)** میں اس بات کی جانب خاص توجہ دی ہے کہ یہ ترجمہ نہ تو بالکل لفظی ہو اور نہ ہی بالکل آزاد۔ اس ترجمہ کے ساتھ ایک جامع تفسیر بھی ہے۔ مولانا کا منصوبہ اسے تیس جلدوں میں مکمل کرنے کا ہے جس میں سے پہلی جلد منظر عام پر آچکی ہے، ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا کی روش یہ ہے کہ اسے اصل متن کی روح سے دور نہ ہونے دیا جائے۔ مولانا کے مطابق ''قرآن کی مقدس آیتوں کا ترجمہ کرتے وقت یہ بات ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ یہ ایک ''کتاب ہدایت'' ہے۔ اس کا ''کتاب ہدایت'' ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا ترجمہ ایسا ہو جسے لوگ باآسانی سمجھ سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی معجزاتی بلاغت اور ادبی چاشنی کو بھی کسی قیمت پر قربان نہیں کرنا چاہئے۔'' اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ نقوی کا یہ ترجمہ سادگی اور قرآنی پیغام کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کے اسلوب کا ایک اچھا امتزاج ہے۔ ثانیاً، ہمیں معلوم ہے کہ قرآن نہ تو مکمل نثر ہے اور نہ ہی مکمل نظم کیونکہ اس کے اندر دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یعنی قرآنی آیات نثر کی سنجیدگی، بلاغت اور نظم کی مٹھاس سمیٹے ہوئے ہیں۔ اپنے منفرد انداز کے علاوہ قاری اور سامعین پر ہونے والے اثر کے لحاظ سے بھی یہ کتاب بے مثال ہے۔ قرآن کے مترجم کو بھی اپنے ترجمہ میں اس اسلوب اور طرز کو اپنانا چاہئے تاکہ اس کا ترجمہ روح قرآن سے زیادہ قریب رہ سکے۔ اس کے جملوں کی ساخت اور الفاظ کے انتخاب میں ایک شاعرانہ جھلک ضرور آنی چاہئے۔ علامہ نقوی کے ترجمہ میں ہمیں اس خیال کی تائید نظر آتی ہے کیونکہ موصوف نے آیتوں کا ترجمہ ایسے انداز سے کیا ہے جو شاعری نہیں تو اس کے بہت قریب ضرور ہے۔ علامہ کے اس ترجمہ میں اصل عربی متن کو بھی انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے اور اس کے لئے انھوں نے اپنا ایک خاص نظام بنایا ہے جو اب تک مروّجہ نظام سے زیادہ بہتر اور سمجھنے میں آسان ہے۔ ابھی عربی کو انگریزی میں لکھنے کا جو نظام چل رہا تھا وہ مغربی مفکرین کی ایجاد ہے۔ جیسے مسائل کے استنباط پر خاص زور دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی تفسیریں ایسی بھی ہیں جو بنیادی طور پر قرآنی آیات کے مفصل شان نزول اور آنحضرتؐ کے دور رسالتؐ میں لڑی گئی اسلامی جنگوں کے حالات بیان

کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''اللہ نے بدر کے دن تمہاری بڑی مدد کی۔'' اب اس آیت کے ذیل میں جنگ بدر کا پورا واقعہ مع تاریخی شواہد کے درج کیا گیا ہے۔

ان مثالوں کے یہاں بیان کرنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ان موضوعات کی اہمیت کو ذرّہ برابر بھی کم کیا جائے، یقیناً یہ تمام باتیں تفسیر قرآن کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہیں، اور ہم ان مفسرین اور جلیل القدر علماء کے علمی کارناموں سے انکار نہیں کر سکتے جنھوں نے ان مضامین کے سلسلہ میں سخت محنت اور تحقیق سے کام لیا اور ہمارے لئے ایک قیمتی اثاثہ چھوڑا۔ یہاں توجہ دینے کی بات یہ ہے کہ بدقسمتی سے جس موضوع پر سب سے زیادہ زور دینا چاہئے تھا، وہ اکثر مفسرین کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گیا یعنی قرآنی آیتوں سے سماجی اور انفرادی زندگی کے اصول ہدایت اور موجودہ زمانہ کے مسائل کا حل دریافت کرنا! یہی وہ موضوع ہے جس پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ علامہ علی محمد نقوی نے اس موضوع کو اپنی تفسیر کے لئے اصل اصول قرار دیا ہے۔ اپنے مقدمہ میں سب سے پہلے انھوں نے اسی بات کو اٹھایا ہے۔ انھیں کے الفاظ میں: ''قرآن مجید نہ تو تاریخ کی کتاب ہے اور نہ ہی قصص انبیاء کی، یہ نہ تو قانون اور فقہ کی کتاب ہے اور نہ محض ایک ادبی شاہکار، البتہ بنیادی طور پر یہ ایک کتاب ہدایت ہے۔ اس میں مذکورہ بالا تمام عناصر پائے جاتے ہیں، مگر اسی حد تک جہاں تک مقصد ہدایت پورا ہو جائے۔ اس کتاب کا اولین مقصد اسلامی نظام کی علمی اور اخلاقی بنیاد نہایت واضح انداز میں فراہم کرنا ہے۔ ایک مکمل اسلامی طریقہ زندگی کے لئے قرآن کا طرز ہدایت ایسا ہے جس کے لئے دقیق قوانین اور اس کے مختلف شعبوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک نظریاتی خاکہ بنانے کی ضرورت ہے، جو کہیں کہیں علامتی بھی ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم صرف جزیرہ عرب کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لئے منبع ہدایت ہے۔ قرآن نے کبھی صرف عربوں کی ہدایت کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ خود کو پوری نسل انسانی کے لئے باعث ہدایت قرار دیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ''یہ (قرآن) ماہ رمضان میں نازل ہوا اور تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔''

یقیناً قرآن پوری دنیائے انسانیت کے لئے کتاب ہدایت ہے۔ لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب ہی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن انھیں کی زبان، ماحول، تاریخ اور مزاج کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مروّجہ نظام میں علامتیں اتنی مشکل ہیں کہ عام قاری کے لئے انھیں پڑھنا خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر 'ع' اور 'ا' کی علامتیں۔ علامہ نقوی نے عربی کو انگریزی میں اس طرح منتقل کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربی حروف کو جاننے والے حضرات آسانی کے ساتھ انگریزی میں اس کی تلاوت کر سکتے ہیں اور انھیں ہر علامت پہچاننے کے لئے فہرست دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

تفسیر

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے انتقال کے بعد سے اب تک ہر صدی میں قرآن مجید کی مختلف تفسیریں لکھی جاتی رہی ہیں، ان میں سے زیادہ تر تفسیریں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں اور باقی دوسری زبانوں میں بھی۔ بیسویں صدی میں قرآن کی درجنوں تفسیریں سامنے آئی ہیں جن میں انگریزی زبان کی تفسیریں بھی شامل ہیں۔ حالانکہ میری محدود معلومات کے مطابق انگریزی میں ابھی تک کوئی مفصل تفسیر قرآن شائع نہیں ہوئی۔ مگر پھر بھی اگر تمام زبانوں میں لکھی گئی تفسیروں کو یکجا کیا جائے تو ان کے متعلق چند باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اولاً یہ کہ اکثر قرآن مجید کی تفسیریں اس کے تاریخی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ قرآنی واقعات اور اس میں مذکورہ شخصیتوں کی چھان بین میں کئی کئی جلدیں صرف کی گئی ہیں۔ قوم بنی اسرائیل کے عقائد و اعمال کی تحقیق میں ہزار ہا صفحات سیاہ کئے گئے نیز انجیل، زبور اور توریت سے اس کے موازنہ پر بھی کافی کچھ لکھا گیا ہے، مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر۔

دوسری چیز جس پر مفسرین نے اپنی تفسیروں میں بہت زیادہ توجہ دی ہے وہ قرآن کا زبانی اور ادبی پہلو ہے۔ علامہ زمخشری کی ''الکشاف'' سے لے کر آج کی بہت سی تفسیروں تک قرآن کی ادبیت اور اس کے الفاظ ان علماء کی توجہات کے خاص محور رہے ہیں۔ الفاظ کی ابتداء ان کے استعمال اور صرف ونحو کے لحاظ سے ان کی اہمیت پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

تیسری طرح کی بہت سی تفسیریں ایسی ہیں جو خالص فقہی طرز فکر کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ جیسے نکاح، طلاق، وضو غسل وغیرہ کا بیان۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آفاقی حقیقتوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے والی آیتوں سے نظام حیات انسانی کے بنیادی اصول مستنبط کئے جائیں اور انھیں قرآنی تعلیمات کے پیرایہ میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اس تفسیر میں مولانا کی کوشش یہی ہے کہ قرآنی تعلیمات کے ذریعہ دور حاضر کے مسائل کا حل ڈھونڈھا جائے اور اس نظام پر روشنی ڈالی جائے جو ہماری زندگی کے لئے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اپنے مقدمہ میں مولانا سخن طراز ہیں: ''قرآن کریم ہمارے سامنے ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے جس سے سماجی اور انفرادی زندگی کا کوئی بھی پہلو اچھوتا نہیں ہے۔ قرآن آپ کو مادی یا روحانی دنیاوی یا اخروی جیسے خانوں میں قید نہیں کرتا بلکہ واحد اور ناقابل تقسیم نظام کی تشکیل کرتا ہے اور ہم اسے طرز فکر سے تعبیر کرتے ہیں۔''

علامہ علی محمد نقوی کے مطابق قرآن مجید کا انداز بیان نظم یا مثنوی کے مقابلے میں غزل سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ اس طرح قرآن کے معنی تک پہنچنے کے لئے کبھی کبھی ایک آیت یا چند آیتیں کافی ہوسکتی ہیں۔ جب کہ مولانا حمیدالدین فراہی کے عقیدۂ نظم قرآن کے مطابق، قرآن کے اصل ابواب اس کے مختلف سورے ہیں جو آپس میں

ایک دوسرے سے مرتبت ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا نقوی خود تحریر فرماتے ہیں: ''(علامہ فراہی) کے بعد کے زیادہ تر مفسرین نے نظم قرآن ہی پر زیادہ زور صرف کیا ہے جب کہ ہماری ناچیز رائے میں نظم قرآن سے زیادہ اہم کام نظام قرآن کی تبلیغ و ترویج ہے، جب کہ ہوتا یہ ہے کہ بعض مقامات پر ہم نظر کے پھیر میں پڑ کر نظام کو قربان کر دیتے ہیں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر ہم ہر آیت کو الگ الگ یا بعض مقامات پر چند آیتوں کو ایک ساتھ لے کر غور کریں تو ہم قرآن کریم کے زیادہ گہرے مفاہیم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور اسی کے ساتھ نظام حیات اور اسلامی قوانین بھی ہم پر زیادہ واضح انداز میں منکشف ہوتے ہیں، بجائے اس کے کہ ہم پورے قرآن میں نظم کی تلاش کرتے رہیں۔''

علامہ نقوی نے پہلی جلد میں تو واضح نہیں کیا ہے البتہ دوسری جلد کے لئے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے اس نظریۂ پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے کہ کس طرح نظم کی تلاش میں نظام قربان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیت: اللہ اس قوم کی حالت کبھی نہیں تبدیل کرتا ہے جب تک وہ لوگ خود اپنے (نفس کی) حالت کو نہیں بدل دیتے۔''(13:12) قرآن کی یہ مقدس آیت سماجی بدلاؤ کے ایک اہم ترین اصول کی جانب اشارہ کر رہی ہے اور انسانی سماج کے عروج وزوال کی پوری تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن میں یہ آیۂ مبارکہ ان چند آیتوں کے بعد رکھی گئی ہے جس میں کفار مکہ کا ذکر موجود ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کوئی بھی نبی فلسفیوں کی طرح خالص مجرد اور تصوراتی انداز میں گفتگو نہیں کرتا اور اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات زندگی کے سانچہ میں نہ ڈھل کے صرف کاغذوں کے ڈھیر تک محدود رہ جاتیں۔ وحی الٰہی کا طرز تکلم ہی یہ ہے کہ وہ اسی انداز اور زبان میں گفتگو کرتی ہے جس ماحول میں نازل ہوتی ہے، وہ انہیں شخصیات اور واقعات کا ذکر کرتی ہے جن سے قوم واقف ہوتی ہے۔ مگر وہ شخصیات اور واقعات کا ذکر آفاقی حقیقتوں کی علامت کے طور پر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ''ابولہب'' صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ برائی کو بڑھاوا دینے اور حق کی راہ میں حائل ہو جانے والی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہر دور اور ہر سماج میں پائی جاتی ہو۔ وحی الٰہی کو اسی انداز میں سمجھا جانا چاہئے۔

قرآن بے شک انہیں حقائق اور واقعات کا اظہار کرتا ہے جن سے مخاطب اول قوم پہلے سے شناسا ہوتی ہے مگر دیکھنا یہ چاہئے کہ کیا اس دور کے عربوں کے مشرکانہ عقائد کی رد میں قرآن جو کچھ پیش کرتا ہے وہ دنیا کے دوسرے مشرکانہ عقاید اور ان کی بدلی ہوئی شکلوں کے لئے بھی صحیح ہے یا نہیں۔

علامہ علی محمد نقوی کی اس تفسیر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مطالعہ قرآن کے لئے نظامی طرز فکر کو خاص اہمیت دی ہے۔

مولانا موصوف نے اپنی تفسیر میں اس پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ نظم قرآن کی رو سے اگر آیات مبارکہ کے عمیق ترین مفاہیم کو صرف کفار مکہ اور ان کے دور سے محدود کر دیا جائے تو یقیناً یہ ان آیات مبارکہ کی روح کے خون کر دینے کے مترادف ہوگا۔

